ISSN (**Print**): 2709-9636 | ISSN (**Online**): 2709-9644
Volume 2, Issue IV, (October to Decmber 2021)

یوسف نون
پی ایچ ڈی سکالر شعبہ اردو، بہاء الدین زکریا یونیورسٹی، ملتان
ڈاکٹر قاضی عابد
پروفیسر شعبہ اردو، بہاء الدین زکریا یونیورسٹی، ملتان ۔

جہاد افغان: تاریخیت و نو تاریخیت اور ناول "قلعہ جنگی"

(ایک پس جدید پڑھت)

Yousaf Noon
PhD Scholar, Department of Urdu, Bahauddin Zakariya University, Multan
Dr. Qazi Abid
Professor, Department of Urdu, Bahauddin Zakariya University, Multan.

Jihad e Afghan, Historicism, New historicism and "Qalla Jangee" a Novel (A Post Modern Reading)

"Qalla Jangee", a novel written by Mustansar Hussain Tarar in the background of Afghan Jihad, represents the both- historicism and new historicism. Through different characters he presented the complete story of Afghan Jihad including all its phases i.e. beginning, climax and end. To attain the target of disintegration of USSR, America fabricated a fake narrative of 'Jihad' and utilized Pakistan as a chess man. Later on, when America needed to put aside Taliban, it again utilized Pakistan as a chess man. In " Qalla Jangee" Tarar reveals the fact of Jihad e Afghan projecting seven characters who were survived in a cell. New historicism is the rebirth of history. It deals with the characters and aspects which were ignored or misinterpreted. Tarar particularly depicted the outcomes of the war which affected Afghan masses. History ignored these outcomes earlier.

Keywords: *Taliban, Jihad, Qalla Jangee, Historicism, New Historicism.*

افغانستان میں جنگ جوئی کی تاریخ کافی طویل ہے۔ ۲۷ ستمبر ۱۹۷۹ء روسی فوج اشتراکی حکومت کی حمایت میں افغانستان اترتی ہے اور افغان حکومت کا تختہ الٹ کر اقتدار پر قابض ہو جاتی ہے۔ روس کے لیے اقتدار کا حصول جس قدر آسان رہا اسے قائم رکھنا کہیں زیادہ دشوار ثابت ہوا۔ روسیوں کو مسلسل افغان جنگ جوؤں اور امریکہ سعودی عرب کے اشتراک سے پاکستان ساختہ طالبان کی مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا۔ روس کے خلاف جنگ کو افغان جہاد کا نام دیا گیا، اس میں شامل جنگ جو مجاہدین کے نام سے موسوم ہوئے۔ ۱۹۸۹ء میں سویت فوج کا انخلا ہو جاتا ہے۔ سویت فوج کے انخلا کے بعد عسکری گروہ آپس میں برسرِپیکار نظر آتے ہیں۔ اس ساری صورت حال میں وہ پاکستانی مدرسوں کے طالب علم جو روسی فوج کے ساتھ لڑے تھے۔ فائدہ اٹھا کر تحریک طالبان کی صورت میں ۱۹۹۴ء کو مجاہدین کی بدعنوانی اور بدامنی کے خلاف متحد ہو کر اقتدار سنبھال لیتے ہیں۔ مجاہدین کی بدامنی سے تنگ عوام شروع میں طالبان کو خاص پذیرائی بخشتے ہیں، مگر ان کی سخت پالیسیوں کے سبب بہت جلد متنفر ہو جاتے ہیں۔ ۹/۱۱ کے واقعہ کے بعد طالبان کا خاتمہ امریکہ نے القاعدہ کو پناہ دینے کی پاداش میں کیا۔ امریکہ نے جس طرح پاکستان کو سویت یونین کے خاتمے کے لیے مہرے کے طور پر استعمال کیا تھا، وہی کام امریکہ نے طالبان نیٹ ورک کے خاتمہ کے لیے پاکستان سے لیا ہے۔ یہ جنگ میں جو چالیس سال کے عرصہ پر محیط ہے، میں حریفوں اور حلیفوں کے جانی اور مالی نقصان کے جو بھی تخمینے لگائے گئے ہیں، اصل سے کہیں کم ہیں۔ اس جنگ کے اثرات دونوں ہمسایہ ممالک پاکستان اور افغانستان پر بہت گہرے ہیں۔ بے گناہ عوام اس جنگ سے بہت متاثر ہوئی، اس جنگ کے نتیجے میں لاکھوں مہاجرت سے اور ہزاروں موت سے گزرے ہیں۔ پاکستان کو ان لاکھوں مہاجرین کے ساتھ ساتھ دہشت گردی کا بھی بوجھ اٹھانا پڑا، اس دہشت گردی نے ہزاروں بے گناہ پاکستانیوں کا خون کیا۔ مہاجرین کا بوجھ ہماری معاشی کشتی جو پہلے ہی ڈانواں ڈول تھی، کے ڈوبنے کے لیے کافی ثابت ہوتا ہے۔ سویت کا افغانستان میں اترنے کا مقصد افغانستان میں اشتراکیت کی حمایت ہو یا اسلامی شدت پسندی سے اپنی سرحدوں کی حفاظت، پاکستان کے صدر جنرل ضیاء الحق کا سویت افغان جنگ میں مجاہدین کی حمایت کا مقصد خواہ سویت فوج کی گرم پانیوں تک رسائی کو روکنا ہو یا محض امریکہ کا آلہ کار بننا، امریکہ کا طالبان سے جنگ کا مقصد دہشت گردوں کا خاتمہ ہو یا پھر اپنے بچھائے ہوئے کانٹوں کو صاف کرنا، جو کچھ بھی ہو مگر اس جنگ نے دونوں ممالک (پاکستان اور افغانستان) کی عوام کو ہلا کر رکھ دیا ہے۔ زور آور، نمائندہ اور خاص طبقات سے تاریخ اور عوام، نچلے اور مظلوم طبقات سے نو تاریخیت کو سروکار ہوتا ہے۔ تاریخیت کی نو تاریخیت ادب کا ہی ایک خاصا ہے۔

ISSN (**Print**): 2709-9636 | ISSN (**Online**): 2709-9644
Volume 2, Issue IV, (October to Decmber 2021)

مستنصر حسین تارڑ کا ناول "قلعہ جنگی" (۲۰۰۸ء) افغان جنگ کے پس منظر میں لکھا گیا ہے۔ نائن الیون کے بعد پاکستان اور امریکہ کی بدلتی پالیسی طالبان کے نیٹ ورکس اور حکومت کو ختم کرنے نکلی تھی۔ اس سب کے باوجود افغان سرحدوں کے قریب ضیاء الحق کے بنائے گئے شہید ساز ادارے (مدارس) برابر افرادی قوت باہم پہنچاتے رہے ہیں۔ یہ سادہ لوح لوگ جنہیں مذہبی بیانیہ نے جذبہ شہادت سے سرشار کر دیا تھا۔ اپنے انجام اور دشمن کی طاقت سے بے خبر اپنے پیارے اسلام کو بچانے نکلے تھے۔ تارڑ نے "قلعہ جنگی" کے تاریخی واقعہ کے پس منظر میں ہماری جہادی پالیسوں اور اس کے اثرات کو واضح کیا ہے۔

تارڑ کا ناول "قلعہ جنگی" زمان و مکان کے اعتبار سے اس بغاوت کی کہانی ہے جو سات روز تک افغانستان کے شہر مزار شریف کے علاقہ قندوز میں واقعہ ایک قلعہ میں برپا رہی۔ یہ واقعہ ۲۵ نومبر سے یکم دسمبر ۲۰۰۱ء تک کا ہے۔ جب قندوز میں مخالف طالبان پسپا ہو کر اپنی جانیں بچانے کے لیے عبدالرشید دوستم کے سامنے ہتھیار ڈالنے پر مجبور ہوتے ہیں۔ ان قیدیوں کو قلعہ جنگی میں لایا جاتا ہے، ان کے ہاتھ پیٹھ پیچھے باندھے جارہے ہیں، تلاشی کے دوران تذلیل و ہزیمت ان کا مقدر بن چکی ہے۔ اس کے بعد اجتماعی موت کے بادل ان پر صاف منڈلاتے نظر آتے ہیں۔ کچھ طالبان جن کے ہاتھ باندھنا باقی تھے، اپنی گھیر دار شلواروں سے اسلحہ نکال کر بغاوت پر اتر آتے ہیں۔ سات دن اور راتوں کے مقابلے کے باوجود جب بغاوت نہ کچلی جاسکی تو جنرل عبدالرشید دوستم نے امریکی اتحاد کو فریاد کر کے بغاوت کچلنے کی دعوت دی، جنہوں نے کارپٹ بمباری سے سارے قلعہ کو سیکنڈوں میں لاشوں کے جنگل میں بدل دیا۔ یہ واقعہ ناول کی بنیاد بنتا ہے۔

> "مزار شریف میں ہتھیار ڈالنے کے بعد وہ انہیں ہانکتے ہوئے قلعہ جنگی میں لے آئے تھے۔۔۔ اور پھر ان کی مشکیں کسی جانے لگیں۔ پشت پیچھے ہاتھ باندھے جانے لگے تو وہ نروس ہوگئے۔۔۔ وہاں دو غیر ملکی ٹیلی ویژن ٹیمیں بھی موجود تھیں جن کے کیمرے ان پر تھے۔۔۔ وہ ہراساں ہوگئے کہ اب انہیں اجتماعی طور پر قتل کیا جانے لگا ہے کہ روائت یہی تھی اور جن کے ہاتھ ابھی بندھے ہوئے نہیں تھے انہوں نے بغاوت کر دی۔۔۔ شمالیوں کو اس کی توقع نہیں تھی وہ تو انہیں فتنہ پروری سے روکنے کے لیے باندھ رہے تھے۔۔۔ ان کے قتل کا فیصلہ ابھی نہیں ہوا تھا لیکن وہ حواس کھو بیٹھے اور جن کی تلاشی مکمل نہیں ہوئی تھی وہ اپنے ہتھیار نکال کر فائر کرنے لگے۔۔۔ دوستم کا چیف ان کا نشانہ بن گیا۔۔۔ ایک

ISSN (**Print**): 2709-9636 | ISSN (**Online**): 2709-9644
Volume 2, Issue IV, (October to Decmber 2021)

امریکی سی آئی اے کے ایجنٹ کے پرخچے اڑ گئے اور پھر ان پر بی۔۵۲ کا عتاب نازل ہو گیا۔۔۔ قلعے کی دیواروں میں نصب مشین گنوں نے جو کچھ ان کے بس میں تھا سب کا سب اُگل دیا۔۔۔ ڈیزی کٹر اور بنکر بسٹر آسمان سے نازل ہونے لگے اور کچے صحن میں مٹی کے آتش فشاں اُبل کر انہیں زندہ دفن کرنے لگے۔"[۱]

یہ لمحات قلعہ میں نشانہ بننے والوں کے لیے کسی قیامت سے ہر گز کم نہ تھے۔ ایک لخت میں سب نفوس خاک ہو گئے۔ خوش قسمتی سے زیادہ ان سات نفوس کی بد بختی کہا جائے تو بجا ہو گا جو کرشماتی طور پر بچ کر قلعہ جنگی کے تہہ خانے میں مردہ گھوڑے کا گوشت کھا کر زندگی اور موت کی کشمکش میں تھے۔ سات روز کی لڑائی کے بعد زخموں سے چور ایک زخمی گھوڑے کی لاش کو نوچتے ہوئے سات روز یا اس سے کم زندگی کی اذیت کو برداشت کرتے ہوئے اپنی ہڈبیتی پیش کرتے ہیں۔ ہر کردار کا جداگانہ تہذیبی، سماجی اور معاشی پس منظر دراصل افغان جہاد اور اسے جاری رکھنے والوں کا اجتماعی منظر نامہ ہے۔ ساتوں کردار ایک جگہ پر ایک سی کیفیت سے گزر رہے ہیں۔ پیش منظر ایک، مگر پس منظر سب کا جداگانہ ہے۔

ہر کردار اپنا جداگانہ سیاسی، سماجی، معاشرتی، معاشی اور جغرافیائی و نسلی پس منظر کا حامل ہے۔ پنجاب کی سرزمین سے تعلق رکھنے والا کم ذات اور غریب طبقے کا اللہ بخش، کل شیر ولی جو دیر کا رہائشی ہے اور نچلے طبقے سے تعلق رکھتا ہے۔ عرب شاہی خاندان سے تعلق رکھنے والا عبد الوہاب الغامدی، امریکی نو مسلم عبد الحمید جان واکر المعروف سلمان فارسی، پاکستانی آرمی جنرل اور جہاد افغان کے اہم کردار ارتضیٰ کا بیٹا مرتضیٰ بیگ، پاکستانی نژاد انگلینڈ کی نودولتیا کا بیٹا ہاشم میر اور چیچنی مسلمان ابو طالب چی چی ایسے سات کرداروں کے گرد ناول کی کہانی گھومتی ہے۔ ناول کا پلاٹ سات کرداروں کے پس منظر پر مبنی سات الگ کہانیوں کو ایک ایک منظر نامہ میں مہارت سے پیش کرتا ہے۔ یہ سات کردار دراصل طالبان کے اجتماع ضدین کی نمائندگی کرتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ آخر کیا چیز ایسی تھی جس نے اس اجتماع ضدین کو مجتمع کیا اور ایک ساتھ جوڑے رکھا؟ دراصل ناول میں مصنف نے اس جواب کو تلاشا ہے۔ الگ الگ جغرافیہ اور تہذیب و معاشرت سے تعلق رکھنے والے سات افراد کی داستان دراصل اس جغرافیہ میں طالبان کی نفوذ پذیری اور فکری عمل پذیری کی داستان ہے۔ یہ ناول نگار کی کامیابی ہے کہ انہوں نے الگ الگ کہانیوں کو بمعائے ان کے پس و پیش منظر کے اس طور مہارت سے جوڑا ہے کہ مرکزی کہانی اور پلاٹ کی بنت میں کوئی جھول نہیں آنے پایا۔

ISSN (**Print**): 2709-9636 | ISSN (**Online**): 2709-9644
Volume 2, Issue IV, (October to Decmber 2021)

ناول ایک خوں ریز واقعہ کو بنیاد بناتا ہے۔ پورے ناول پر سوگواریت اور خوفناکی کی فضا موجود ہے۔ لاشوں کا بے انت جنگل دن گزرنے کے ساتھ ساتھ تعفن اور مسخ ہوتی لاشوں سے اس ہولناکی میں اضافہ کر رہا ہے۔ یہ لاشیں دشمن کی سفاکی کا منہ بولتا ثبوت پیش کر رہی ہیں۔

> ''کچھ کی ٹانگیں اور کچھ کے کمر سے اوپر والے دھڑ مٹی میں دفن تھے۔۔۔ جیسے وہ ریت میں کھیلتے بچے تھے۔ چھپن چھپائی کھیلتے اپنی ٹانگیں چھپاتے تھے۔ اپنے چہرے روپوش کرتے تھے۔۔۔ انہیں انسانی ہاتھوں نے نہیں۔۔۔ بی باون طیاروں نے نیم دفن کیا تھا۔ صحن میں جگہ جگہ گہرے گڑھے تھے جیسے وہاں مٹی کے آتش فشاں اُبل کر ٹھنڈے ہو گئے ہوں۔ ایسے گڑھے تخلیق کرنا صرف ڈیزی کٹر ایسے منی ایٹم بم اور بنکر بسٹرز کے بس کی بات تھی۔''(۲)

نو تاریخیت تاریخ کی از سر نو بازیافت ہے۔ اس میں تاریخی کے ساتھ سماجی سیاق کو بھی ساتھ رکھا جاتا ہے۔ ایسے سماجی طبقات جنہیں تاریخیت قابلِ توجہ نہیں سمجھتی۔ انہیں نو تاریخیت برابر اہمیت دیتی ہے۔ افغان جنگ نے پاکستان اور افغانستان کے سیاسی اور معاشی منظر نامہ پر دور رس اثرات مرتب کیے وہیں سماجی اثرات سے بھی مصر نہیں۔ مسلسل جنگ اور برودی سرنگوں نے گول کیپروں کی پیداوار میں اہم کردار ادا کیا۔ قدرت نے تو انہیں پورا کھلاڑی پیدا کیا تھا، بارودی سرنگوں نے انہیں گول کیپر بنا دیا ہے جنہوں نے ملک کی باگ دوڑ سنبھالنی تھی اب ان کا کردار محدود ہو کر رہ گیا ہے۔ افغان بچوں کو فٹ بال میچ کے دوران ایک سنجیدہ مسئلہ درپیش تھا کہ ان کی ٹیم میں کھلاڑی کم اور گول کیپر زیادہ تھے۔ یہ مسئلہ گزشتہ پچیس سال سے درپیش تھا اور گول کیپروں کی تعداد میں روز بروز اضافہ ہو رہا تھا۔ ان کا کھیل اب خاص افغانی سٹائل کا تھا جس میں ہمیشہ کھلاڑی کم اور گول کیپر زیادہ ہوا کرتے تھے۔ ناول نگار نے اس جنگ کے معصوم ذہنوں اور جسموں پر اثرات کو ایک فٹ بال کے کھیل سے پوری گھمبیرتا سے فکشنایا ہے۔ اس صورت حال کو اپنے پورے احساس اور کرب کے ساتھ ایک خالص تاریخی دستاویز عاری ہے۔

> ''گول کیپر زیادہ ہو جاتے اور کھلاڑی کم۔ اور جو لوگ کیپر ہوتے ہوتے تھے، وہ بس گول کیپر ہی ہو سکتے تھے، یہ ان کی مجبوری تھی۔۔۔ افغانی مٹی میں لاکھوں کی تعداد میں بارودی سرنگیں دفن تھیں۔۔۔ انہیں بچھانے والے روسی بھی تھے اور افغانی بھی، لیکن انہیں سمیٹنے والا کوئی نہ تھا۔ بالغ افراد تو سنبھل کے چلتے ہیں، بچے بے دھیان ہوتے ہیں اور کبھی اپنی جان

ISSN (**Print**): 2709-9636 | ISSN (**Online**): 2709-9644
Volume 2, Issue IV, (October to Decmber 2021)

اور اکثر اپنی ٹانگیں گنوا بیٹھتے ہیں۔ تو ایک ٹانگ سے محروم ایک بچہ گول کیپر نہ ہو تو اور کیا ہو۔۔۔ شائد نہیں یقینا دنیا بھر میں سب سے زیادہ گول کیپر بچے افغانستان میں پائے جاتے ہیں اور یہ ایسا ریکارڈ ہے جس کا اندراج کہیں بھی نہیں ہوا۔"(۳)

ناول کا انتساب بھی ایسے بارودی سرنگوں سے اپاہج گول کیپروں کے نام کیا گیا ہے۔ ناول میں ایک بچہ کردار فرمان اللہ سامنے آتا ہے جو اپنے کھیل کے میدان قلعہ جنگی کی طرف اپنے بڑوں سے آنکھ بچا کر نکلتا ہے۔ اسے قلعہ جنگی میں لاشوں کا منظر حیران تو کرتا ہے مگر خوف زدہ ہرگز نہیں۔ عرصہ سے افغانستان کے دارالحرب بننے سے وہاں لڑنے والے روسی، امریکی اور طالبان انہیں مسلسل لاشیں مہیا کر رہے تھے۔ ایک افغان بچے کے لیے راستے میں، کھیتوں یا گھر میں پڑی دو چار لاشیں معمول کی بات تھی۔ بچے کے خوف زدہ ہونے یا افسوس کرنے کی بجائے اس کے من میں ایک عجب خواہش نے انگڑائی لی، وہاں پر موجود متعدد سر اسے فٹ بال لگنے لگے۔(۴) دیگر دوستوں کی عدم موجودگی اسے افسردہ کر دیتی ہے۔ اگر وہ موجود ہوتے تو ان دستیاب انسانی کھوپڑیوں سے فٹ بال کھیل کر لطف اٹھا سکتا تھا۔

....

جنرل ضیاء نے جہادی مشن کو عروج بخشا۔ ہر گلی محلے، مسجد، سکول اور کالج یونیورسٹی سے نوجوان جہادی تربیت کیمپوں کو کھچے چلے گئے۔ اس بیج کو بونے اور پنیری تیار کر کے پھیلانے میں ہمارے دینی مدارس نے بے حد اہم کردار ادا کیا۔ یہ فصل جب پک کر تیار ہو چکی تو اسے کاٹنے کا فریضہ پرویز مشرف کو سونپا گیا۔ جو مجاہد اسلام تھے۔ وہی دہشت گرد گردانے جانے لگے۔ جو کبھی قوم و ملت کے ماتھے کا جھومر تھے۔ اب ناسور بن کے رہ گئے تھے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وقت کے سات ساتھ ایک ہی چیز کے ٹائٹل کیوں بدلے؟ کیا ہم غلطی پر تھے؟ ہماری اپنی سوچ نہ تھی؟ ہمیں کسی نے اپنے عزائم کے لیے استعمال تو نہیں کیا؟ استعمال کیا ہے تو ہم استعمال ہوئے کیوں؟ ان سارے سوالوں کے دو جوابات ملتے ہیں۔ جہادیوں یا دہشت گردوں کو اس جہاد یا دہشت گردی میں دھکیلنے والی دو چیزیں ہیں، غربت اور جہالت۔ دہشت گردی کے یہ دو محرک اسباب بڑے بڑے ماہرینِ سماجیات و معاشیات قرار دیتے ہیں۔ قلعہ جنگی کے کرداروں کا اس نقطہ نظر سے جائزہ لیں تو صورت حال کافی حد تک واضح ہو جاتی ہے۔ سات میں سے پانچ کردار ایسے ہیں غربت جن کا مسئلہ ہی نہیں ہے۔ مرزا مرتضیٰ دولت مند پاکستانی جرنیل کا بیٹا ہے۔ ہاشم میر پاکستانی نژاد برطانوی ہے۔ وہ اپنے نودولتیے باپ سے متنفر ہے۔ عبدالوہاب نامی کردار آل سعود سے ہے، جو اعلیٰ

ISSN (**Print**): 2709-9636 | ISSN (**Online**): 2709-9644
Volume 2, Issue IV, (October to Decmber 2021)

تعلیم کے لیے کیمبرج یونیورسٹی کا طالب علم ہے۔ عبد الحمید جانی واکر امریکی باشندہ ہے جو نو مسلم ہے، وہ یہودیت ترک کر کے اور اپنا سب کچھ تج کر جہاد کے لیے نکلا ہوا ہے۔

ایلن جی کروگر نے غربت اور دہشت گردی کے موضوع پر ایک وقیع تحقیق کی ہے۔ انہوں نے مختلف ممالک سے تحقیق کے بعد ثابت کیا ہے کہ دہشت گردی کا مکمل سبب صرف غربت اور جہالت نہیں بلکہ یہ تو کوئی دیگر عوامل میں سے چند عوامل ہیں۔ اگر غربت اور جہالت دہشت گردی کا سبب ہیں تو پھر ہر بندہ دہشت گرد ہوتا۔ کیوں کہ پوری دنیا میں غربت اور جہالت کی شرح امارت اور تعلیم سے کہیں زیادہ ہے۔ این بی کروگر کو شواروں سے ثابت کرتے ہیں کہ دہشت گردی کے محرکات کیا ہیں۔

> ''اس بات کو سمجھنے کے لیے کہ دہشت گرد کیسے بنتے ہیں، کون مضبوط سیاسی عقائد رکھتا ہے اور کیا وہ اتنا با اعتماد ہے کہ اپنے عقائد اور نظریات کے لیے مجبور کر سکے؟ زیادہ تر دہشت گرد وہ غریب نہیں ہوتے جن کے پاس کچھ نہیں ہوتا بلکہ یہ ایسے لوگ ہوتے ہیں یا ہو سکتے جو اپنے عقیدہ اور نظریے کے بارے میں اتنے جذباتی ہو سکتے ہیں کہ جان تک سے گزر جاتے ہیں۔''(۵)

تیار کردہ مجاہدین کرائے کے ٹٹو ہرگز نہ تھے، اگر ایسا ہوتا تو جان ہتھیلی پر رکھ کر یہ سب کچھ نہ کر گزرتے۔ ایک خاص جہادی بیانیہ تشکیل دیا جاتا ہے۔ اس بیانے کو سادہ لوح عوام پر اس طور حاوی کیا جاتا ہے کہ جہاد ایک رومانوی تصور بن کر ابھرتا ہے۔ اس بیانیے نے ناصرف مدارس کے غریب بچوں بلکہ سکول کالجوں اور یونیورسٹیوں میں زیرِ تعلیم کھاتے پیتے چشم و چراغ کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ جہادی عناصر توں پہلے سے ہی ہمارے مذہبی نصاب اور لٹریچر میں موجود تھے۔ اس تصور کو ہمارے مولوی حضرات نے مزید گلیمر ائز کر کے پیش کیا۔ اس مقصد کے لیے مساجد کے منبروں کو کام میں لایا گیا۔ ''سبیلنا سبیلنا الجہاد الجہاد'' کے نعرے لگاتے لمبے بالوں، گھنی داڑھیوں والے اپنے مضبوط ہاتھوں میں اسلحہ تھامے یہ ویلن ہیر وازم کی کشش کے ساتھ منظر نامہ کی زینت بنتے تھے۔(۶) اس راہ میں درپیش موت کو مزید گلیمر ائز کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔ مگر یہ جہاد سے رومانویت زدہ چہرے صرف شہید ساز تھے۔ وہ سادہ لوح لوگوں کو بہلا پھسلا کے اپنے مفادات کی بھٹی میں دھکیل کر دوبارہ نئے شکار کی تلاش میں نکل کھڑا ہوتے تھے۔ گل شیر افغانستان میں لڑی جانے والی جعلی جہاد میں مولوی کے کردار کو یوں بیان کرتا ہے۔

ISSN (**Print**): 2709-9636 | ISSN (**Online**): 2709-9644
Volume 2, Issue IV, (October to Decmber 2021)

"مولوی ہم سے کہتا تھا کہ وہ مسلمان نہیں جو طالبان کی مدد نہ کرے۔۔۔ یارا ہمارے پاس تو اور کچھ تھا نہیں صرف مسلمانی تھی تو اسے ضائع نہیں کرنا تھا۔ امریکہ نے جنگ شروع کیا تو مولوی نے لشکر بنایا۔ کیا جذبہ تھا یارا۔ اس نے دس ہزار مجاہد تیار کیا جس میں بہت ہمارے بوڑھا کی طرح کا بھی تھا لیکن باقی لوگ ہمارے موافق جوان لوگ تھا۔۔۔ بھوک پیاس اور نیند ختم ہو گیا۔ ہم دن رات ایسا نعرہ لگاتا تھا کہ گلا بیٹھ گیا۔ ہمارے پاس ہتھیار تو بہت تھا مگر کم ہو گیا تو مولوی نے کہا، تم لوگ مومن ہے، تلوار سے جہاد کرے گا۔"(۷)

ہم نے سویت یونین کو توڑنے اور افغانستان سے نکالنے کے لیے طالبان امریکہ کے کہنے پر پیدا کیے پھر اسی امریکہ کے ایما پر طالبان نیٹ ورک کو توڑنے کے لیے ہم دوبارہ ان کے حلیف بنے۔ افغانستان میں طالبان ہوں یا شمالی افغان ہوں کسی نے بھی یہ جنگ بیرونی مداخلت کے بنا ہر گز نہیں جیتی۔

....

ساتوں میں سے ہر کردار کی پس منظری ایک الگ کہانی ہے، مگر پیش منظر تو سبھی کا ایک ہے۔ موت سامنے منہ کھولے انہیں نگلنے کے لیے بالکل تیار بیٹھی ہے۔ شاید یہ موت کی وحشت ہے یا کہ جنونیت کے پردے ہٹ چکے ہیں۔ اب معاملات کے تمام پہلو سجھائی دینے لگے ہیں۔ ذہنی گرہیں کھل رہی ہیں، حقائق اپنی اصل حقیقت کو سامنے لاتے ہوئے منہ چڑا رہے ہیں۔ ان حقائق کو عیاں کرنا اور پاکستان میں پروان چڑھنے والے جہادی فلسفہ کی قلعی کھولتا اور اس بیانیے کو رد کرتا ہوا پہلا کردار مرزا مرتضیٰ بیگ کا سامنے آتا ہے۔ یہ کردار جہاد افغان سے بھرپور مستفید ہوتے ایک پاکستانی جرنیل کے بیٹے کا ہے۔ مرتضیٰ بیگ ارتضیٰ بیگ کا اکلوتا بیٹا ہے۔ باپ نے جو کالا دھن مجاہدین کو امریکہ سے آنے والے اسلحے کی رسد سے اکٹھا کیا تھا، بیٹا بھی اس سے بھرپور مستفید ہوتا ہے۔ وہ اپنے باپ کے لکھے جہادی لٹریچر کو پڑھ کر بھی خاصا متاثر ہے، وہ زندگی کی عیاشیوں اور ایک سی عشرت والی زندگی سے اکتا چکا ہے۔ وہ زندگی کے کسی نئے تجربے سے سرشار ہونا چاہتا ہے۔ یہ نیا تجربہ طالبان کے ساتھ شمولیت کے علاوہ اور کیا ہو سکتا تھا۔ شہر کے ہیئر ڈریسر کے طفیل اس نئے مگر تلخ تجربے سے ہم کنار ہوتا ہے۔ وہ سی آئی اے سے منسلک ایک جرنیل کا بیٹا ہے۔ اس لیے اس جنگ میں سی آئی اے کے اہم کردار سے اچھی طرح واقف ہے۔ تہہ خانہ میں موت کے انتظار میں گزارے جانے والے لمحات میں وہ یہ حیرت انگیز اور اہم انکشافات کرتا ہے کہ روس کے خلاف ہماری سی آئی اے نے اسلحہ کی رسد کے ذریعے کس قدر اہم کردار ادا کیا ہے۔ اس دوران انہوں نے ایک بیانیہ تشکیل دیا

ISSN (**Print**): 2709-9636 | ISSN (**Online**): 2709-9644
Volume 2, Issue IV, (October to Decmber 2021)

کہ افغانی پاکستان کی جنگ لڑ رہے ہیں اور ان کی مدد کر کے ہم اپنا قومی اور مذہبی حق ادا کر رہے ہیں۔ اتنے ہم ایماندار کہاں کہ یہ مذہبی اور ملی فریضہ ایمان اور دیانت داری سے سرانجام دیتے۔ ہم نے اسے بہتی گنگا سے خوب ہاتھ دھویا ہے۔ یہ صرف رسد کا بھیانک کھیل ہی نہیں بلکہ طلب بھی ساتھ ساتھ جاری رہتی ہے۔

> ''اسلحے سے بھرے ہوئے یہ کنٹینر کراچی سے ننگر ہار تک اٹیلی جنس کے کرنل ارتضیٰ کی ذاتی نگرانی میں سفر کرتے تھے اور اس طویل سفر کے دوران بار بار رکتے اور متعدد بار کھلتے تھے۔ ان کے آہنی شٹر اٹھتے اور ان میں سے جنرل صاحبان کا حصہ نکال کر آرمی کی جیبوں پر لاد دیا جاتا۔ یہ ایک نارمل پریکٹس تھی۔۔۔ چنانچہ مجاہدین کے کمانڈرز تک پہنچتے پہنچتے یہ کنٹینر خاصے ہلکے ہو چکے ہوتے۔ یہ تو ممکن نہ تھا کرنل صاحب جہاد کے ثمرات کے لیے قیامت تک انتظار کرتے اور اس بہتی گنگا میں ہاتھ نہ دھوتے۔ وہ صرف ہاتھ دھونے پر ہی اکتفا نہ کرتے بلکہ اس میں مکمل اشنان کر کے نروان کی حدوں کو چھونے لگتے۔ اپنی مدد آپ کے اصول پر عمل کرتے ہوئے گجرات اور جہلم کے درمیان کہیں یہ کنٹینر رکتے اور اس بہتی گنگا میں سے بہت کچھ نکال کر اپنے منتظر رفقاء کے حوالے کر دیتے جو انہیں گدھوں پر لاد کر لے جاتے۔۔۔۔ بعد میں صرف اسلحہ کی فروخت سے وہ الیکشن کے اخراجات برداشت کرنے کے قابل ہو جاتے تھے۔ کرنل ارتضیٰ بیگ نے ملکی سیاسی میں ایک نمایاں مقام پایا اور افغان جہاد کے ہیروز میں ان کا شمار کیا جاتا تھا۔''(۸)

یہ رسد کا یک طرفہ انتظام ہرگز نہ تھا۔ اس مقصد کے لیے معاشیات کے طلب و رسد کے اصول سامنے رکھتے ہوئے، طلب و رسد کے توازن کا خاص خیال رکھا گیا تھا۔ اسلحے سے بھرے کنٹینروں کا مال گدھوں کے ذریعے رسد کیا جاتا اور طلب کے طور پر سفید سفوف کی پوٹلیاں انہی گدھوں پر لوڈ ہو کر آتی تھیں۔ اس جہاد نے پاکستان میں نئے کلچر کو پروان چڑھایا، جسے کلاشن کوف کلچر کہا جاتا ہے۔ ناانصافی اور بدامنی کی صورت زہر کھولا گیا۔ اس کلچر سے امریت تو جو مضبوط ہوئی سو ہوئی، اس نے تو جمہوریت کی شکل کو بھی بگاڑ کے رکھ دیا۔ اس جہاد کی حمایت سے، اسلحہ اور منشیات کی فروخت کے دھندے سے کئیوں نے پیسے کے پہاڑ کھڑے کر لیے۔ جمہوریت میں پیسے کی بھرپور اثر انگیزی نے اس کی شکل ہی مسخ کر کے رکھ دی۔ اسلحہ کی رسد صرف اور صرف کنٹینروں تک محدود نہ تھی۔ اس مقدس جنگ میں ایویل ایمپائر کے خاتمے کے لیے ٹرینوں کے ذریعے اسلحہ سپلائی کیا جاتا تھا۔ یہ اسلحہ چینی ساختہ ہوتا

ISSN (**Print**): 2709-9636 | ISSN (**Online**): 2709-9644
Volume 2, Issue IV, (October to Decmber 2021)

تھا۔ جن میں رائفلیں، مشین گنیں، راکٹ لانچر اور مارٹر شیل ہوتے تھے۔ وہ اپنے حریف سوویت یونین کی پسپائی کے لیے مجاہدین کو سپلائی کرتا اور اس کے بدلے میں انکل سام انہیں ڈالروں میں ادائیگی کرتا تھا۔(۹) اس طرح چین کو دوہرا فائدہ ہوا۔ دشمن کا خاتمہ بھی ہو رہا تھا اور کاروبار بھی جم چکا تھا۔ یہ امریکہ کا گھنوناں کھیل تھا، جس کے ہم مہرے بنے۔ پھر یہ سبھی کچھ امریکہ کے گلے کا طوق بنا۔ امریکی وزیر خارجہ ہیلری کلنٹن نے بھی کئی موقعوں پر اعتراف کیا تھا کہ ایسی عفریتیں پیدا کرنا امریکہ کی غلطی تھی۔(۱۰) امریکی اعانت اور اسلحہ کی فراوانی کا ایک بڑا نقصان یہ ہوا کہ کرپشن، رشتوت ستانی اور اسلحہ کی غیر قانونی تجارت کو عروج ملا۔ اس جدوجہد کو پروان چڑھانے کے لیے جنرل ضیاء نے امریکہ سے فنڈز جو لیے تھے ان کے خرچ کے لیے فری ہینڈ مانگ لیا، جس کی قبولیت با آسانی ہو گئی جس کا نتیجہ جو بھی نکلتا ہے اسے اچھا نہیں کہہ سکتے۔ جہاد کے کئی کرتا دھرتاؤں نے اسی بہتنی گنگا میں خوب ہاتھ دھوئے بلکہ اشنان کرتے رہے ہیں۔ اسی رقم سے سیاسی لیڈروں کو خریدا جاتا تھا۔ یہ لیڈر ہر ماہ آئی سی آئی کے ''The Main'' میں حاضری دیتے اور روپوں سے گاڑی بھر کر لے جاتے تھے۔

> ''The Main'' کا ایک وسیع تہہ خانہ تھا جسے سٹرانگ روم کہا جاتا تھا۔ اس تہہ خانے میں ادائیگی کی رقم صندوقوں یا آہنی تجوریوں میں نہیں رکھی جاتی تھی بلکہ اس کی وسعت میں فرش پر ڈھیروں کی صورت۔۔۔ اگرچہ ایک خاص ترتیب اور نفاست سے پڑی ہوتی تھی۔ لاکھوں اور کروڑوں کے حساب سے۔۔۔ بلکہ بے حساب کیونکہ اس کی گنتی کبھی نہیں ہوئی تھی۔ رقم ہمیشہ حسب خواہش کرنسی میں میسر ہوتی۔ سٹرانگ روم کے تہہ خانے کا نصف حصہ ڈالروں سے ڈھکا ہوا تھا۔ ڈالروں کے بعد سعوی ریالوں کی اجارہ داری تھی۔۔۔ پاکستانی روپوں کی بھی افراط تھی اور افغانی بھی تھی جو صرف اس لیے حاصل کیے جاتے کہ ان سے افغانستان میں بر سرپیکار مجاہدین کی حوصلہ افزائی کی جا سکے۔ یہ ایس ایس فنڈ تھا۔۔۔ اس کا کوئی آڈٹ نہ تھا۔۔''(۱۱)

اسی فنڈنگ کے کرشمات تھے کہ ارتضی بیگ نے سیف ہاؤس بنایا ہوا تھا۔ یہ جنت ارضی تھی جس میں مہمان زندگی کی کلفتوں کے کڑوے پانیوں میں ڈبکی لگا کر نکلتے تو سامنے دنیا کی حسین ترین ناف ان کا ہاتھ تھامنے اور بغل گیر ہونے کے لیے بے تاب کھڑی ہوتی۔ ارتضی بیگ اور اس کا بیٹا مرتضیٰ بیگ اس جنت کے ولی وارث تھے۔ لوگوں کو کسی اور جنت کا لالچ دے کر انہیں اپنے گھنونے عزائم کے لیے استعمال کرنے والوں نے اپنی جنت خود اسی

ISSN (**Print**): 2709-9636 | ISSN (**Online**): 2709-9644
Volume 2, Issue IV, (October to Decmber 2021)

دنیا میں بنا رکھی تھی۔ کرنل ارتضیٰ بیگم نے ریٹائرمنٹ کے بعد اس عظیم جہاد کے ثمرات سے ایک انڈسٹریل ایمپائر بنا رکھی تھی۔ روسی طیاروں کو زمین بوس کرنے کے لیے امریکہ سٹنگر منگوائے گئے۔ ایک سٹنگر کی فروخت سے دو تین فیکٹریاں خریدی جاسکتی تھیں۔ کرنل ارتضیٰ کے حصہ میں کچھ سٹنگر آئی تھیں۔ کرنل مرتضیٰ اپنے بیٹے کو اس ایمپائر کا کرائون پرنس بنانا چاہتا تھا۔ ارتضیٰ اس یکسو اور بے عمل عیش و عشرت والی زندگی سے اکتا گیا۔ اس پر باپ کے لکھے جہادی لٹریچر اور افغانی جہاد کے کارناموں کی کتابوں کا خاصا اثر ا ہوا۔ شہر کے حجام سے متاثر ہو کر ایک نئے تجربے اور ایک نئے نشے سے ہم کنار ہونے کے لیے جہادی تربیت کے کیمپ میں پہنچ کر جہاد افغان کا مجاہد بن جاتا ہے۔ یہ صرف ایک مرتضیٰ نہیں بلکہ ان جیسے ہزاروں ایلیٹ طبقہ کے نوجوانوں کی داستان ہے۔ جو ایک رومانس کے پیچھے دنیا جہان کی آسائشوں کو تج کر اس پر خار راستے کے راہی ہوئے، جس کی طرف جانے کے تو کئی راستے ہیں واپسی کے سب راستے مفقود ہیں۔

ایسے طبقے سے متعلق ایک اور کردار پاکستانی نژاد برطانوی ہاشم میر کا ہے۔ وہ اس باپ کا بیٹا ہے جو یورپ جانے کے لیے ہر جائز و ناجائز ہتھکنڈے اپناتے ہیں۔ اس کا والد یورپ رہتے ہوئے دو نمبری سے تمام مراعات حاصل کرتا ہے۔ ہاشم کے والد کی شخصیت دوہرے پن کا شکار ہے وہ جس قدر دوغلی طبیعت کا مالک ہے اور ہر کام میں دو نمبری کرتا ہے۔ اس سے کہیں زیادہ مذہب کی طرف جھکائو رکھتا ہے۔ ہاشم میر کی شخصیت اپنے والد سے بالکل مختلف ہے۔ تعلیمی میدان میں وہ آگے ہے۔ ہاشم میر "لندن سکول آف اکنامکس" کا طالب علم ہے۔ جہادی بیانے نے صرف پاکستان کے دینی مدارس کو متاثر نہیں کیا بلکہ اس نے یورپ کی یونی ورسٹیوں تک کو بھی نہیں چھوڑا۔ دہشت گردی کا ایک معاشرتی سیاق و سباق بھی ہوتا ہے۔ غریب کے علاوہ امیر خاندانوں سے تعلق رکھنے والوں کو دہشت گرد بنانے میں دوستوں، خان دان کے افراد، پڑوسیوں اور دیگر ساتھیوں کا اہم کردار ہو سکتا ہے۔ ایلن جی کروگر کے سروے کے مطابق غریب، پسماندہ اور پڑھے لکھے لوگوں کی نسبت دولت مند پڑھے لکھے اور بڑے عہدوں پر فائز لوگ زیادہ شدت پسند ہوتے ہیں۔[۱۲] مرتضیٰ کو جس طرح ایک حجام نے عیش و عشرت کے محلات سے نکال کر افغانستان کی سنگلاخ زمین پر انسانی گوشت کے جلنے اور بارود کی بو کے درمیان آن کھڑا کیا تھا اسی طرح ہاشم میر کو اس راستے پر لگانے کا سبب ایک عربی ہم جماعت بنتا ہے۔

"یہ ال منصور تھا جو مجھے یہاں لے کر آیا۔۔۔ ذاتی طور پر نہیں۔۔۔ وہ تو شاید ابھی تک لنڈن میں زیر تعلیم ہے اور سوچتا ہے کہ یہ اس کی فکر تھی، جو مجھے یہاں لے آئی۔۔۔ جس

> نے مجھے ایک مقصد دیا۔۔۔ نہیں میں یہاں کفارہ ادا کرنے نہیں آیا۔۔۔۔ اپنا فرض ادا کرنے کے لیے آیا ہوں۔۔۔۔ بے مقصدیت کی۔۔۔۔ اور بے وجہ زندگی کو ایک کائناتی تصور کے حصول کے لیے وقف کرنے کے لیے آیا ہوں۔"(۱۳)

وہ جس کائناتی تصور کے حصول کے لیے نکلا تھا اس کے مقابلے میں سامنے تنگ نظری، تعصب اور جہالت نے انہیں خوش آمدید کہا تھا۔ عبدالحمید جانی واکر بھی اسی طبقے کا فرد ہے۔ امریکی باشدہ جانی واکر جس کا مسلم نام عبدالحمید ہے، جسے کوڈ نیم سلمان فارسی دیا گیا ہے۔ اپنا آبائی مذہب یہودیت کو ترک کر کے مسلمان ہو چکا ہے۔ ایک مہابیانیہ سوشلزم کے سوویت یونین میں ناکامی کے بعد اسے اپنے اس مہابیانے کی تکمیل اس اسلام میں ہوتی نظر آتی ہے۔ وہ تصور کامل کے لیے سب کچھ تج کر پوری دنیا سے بدی کی قوتوں کے خلاف جہاد کرنے کا نظریہ اپنالیتا ہے۔ اسلام قبول کر کے طالبان کے ساتھ جنگ میں شریک ہونے کے بعد طالبان سے جڑا تصور کامل کا بیانیہ سوشلزم سے بھی زیادہ بری طرح پاش پاش ہو جاتا ہے۔

عبدالوہاب الغامدی بھی اعلیٰ طبقے کا فرد اور کیمبرج یونیورسٹی کا طالب علم ہے۔ وہ ایک روایتی عیاش عرب شیخ کا بیٹا ہے جس کے حرم میں حسب روایت ہر رات ایک نیا مہمان ہوتا ہے اور وہ اس جیسے کئی بچوں کا بیج بو چکا ہے۔ عبدالوہاب دیگر عربوں کی نسبت خاصا غیر روایتی واقعہ ہوا ہے۔ وہ بلا کا ذہین اور شراب و شباب سے دور ہے۔ عبدالوہاب اور ان جیسے کئی عرب شہزادوں کو سوویت یونین اور اشتراکیت سے لڑانے کے لیے افغانستان میں جدید اسلحہ دینے اور کر لڑانے والا امریکہ ہے جب امریکیوں کا مشن پورا ہو جاتا ہے تو یہی لوگ دہشت گرد گردانے جاتے ہیں۔(۱۴) یہ عرب شہزادہ تہ خانے میں ایڑیاں رگڑتے ہوئے اپنی سرگزشت یوں بیان کرتا ہے، یہ ایک عبدالوہاب کی سرگزشت نہیں بلکہ پوری القاعدہ کی تاریخ ہے۔

> "پھر یہاں افغانستان میں روسیوں کی حماقت کا آغاز ہو گیا۔ ہزاروں عرب ادھر آنکلے اور القاعدہ کے اسیر ہوئے۔۔۔ میں بھی ان میں سے ایک تھا۔۔۔ ان دنوں امریکہ اور پورا یورپ ہماری پیٹھ تھپکتا تھا۔ ہمیں مجاہدین کہا جاتا تھا اور ہماری جھولیاں ڈالروں اور ہتھیاروں سے بھر دی جاتی تھیں۔۔۔۔ یہی امریکہ مسلمان ملکوں کے نوجوانوں کو مقدس جہاد کے لیے ابھارتا تھا۔ بھرتی کرتا تھا، ٹریننگ دیتا تھا اور یہاں بھیج دیتا تھا۔ تمہیں پتہ ہے کہ ادھر القاعدہ کے جتنے بھی کیمپ ہیں اور تورا بورا اور گردیز میں غاروں کا وسیع جال ہے، یہ سب

ISSN (**Print**): 2709-9636 | ISSN (**Online**): 2709-9644
Volume 2, Issue IV, (October to Decmber 2021)

امریکہ کے زیر نگرانی وجود میں آئے۔ ہم ان کے ہیرو تھے۔ ان کا بڑا ہیرو ریمبو بھی ہمارے شانہ بشانہ لڑتا تھا۔۔۔ لیکن جونہی ''بدی کی سلطنت' کا خاتمہ ہوا تو وہ ہاتھ جھاڑ کر نکل گئے کہ ان کا مقصد پورا ہو چکا تھا۔ ہم وہی مجاہدین اور ہیرو تھے جو ۱۱ ستمبر کے بعد دہشت گرد اور بدترین مجرم بن گئے۔ پہلے یہ جہاد تھا کیونکہ روس مقابل میں تھا اور اب یہ قابل گردن زدنی ہے کیونکہ ہم اپنا دفاع کر رہے ہیں۔''(۱۵)

واضح ہے کہ یہ مفادات کی جنگ تھی، امریکہ نے دونوں بار ہمارے مذہب بیانے کو استعمال کرتے ہوئے اپنے مفادات حاصل کیے۔ اپنے منصوبے کو ثمر بار کرنے کے لیے پروپیگنڈے کے ساتھ ساتھ ایک بڑی سرمایہ کاری بھی کی گئی تھی۔

....

اس جنگ کا ایندھن بڑی تعداد میں ایسے افراد کو بنایا گیا جن کی سماجی، معاشرتی و معاشی اور فکری حیثیت نہ ہونے کے برابر تھی۔ پاکستانی ایجنسیوں نے مُلّا کے ذریعے ایسے طبقات کو معاشی اور فکری سطح پر اپنی گرفت میں لیا، یہ ایسے افراد تھے جن کی اپنی فکر و سوچ نہ ہونے کے برابر تھی اور یہ معاشی طور پر کمزور اور پسا ہوا طبقہ تھا۔ ہمارے سماج میں افرادی قوت کے اعتبار سے جو بہت زیادہ ہے۔ اس جنگ کے موقع پر انہی سے بہتر طور پر ایندھن کا کام لیا جا سکتا تھا۔ اللہ بخش اور شیر گل اس طبقہ کے نمائندہ کردار ہیں۔ اللہ بخش پنجاب کی سرزمین سے تعلق رکھنے والا نوجوان ہے جو ذات کا مراثی ہے۔ انہیں کم تر طبقہ شمار کیا جاتا ہے۔ ہمارے سماج میں مراثیوں سے متعلق کئی لطیفے رائج ہیں جو اس طبقے کی سماجی اقدار کا اندازہ لگانے کے لیے کافی ہیں۔ ان کے لیے بڑی عیاشی پیٹ بھر کر کھانے سے بڑھ کر نہیں۔ طبقاتی نظام میں پسے یہ افراد جب مدرسوں میں جاتے ہیں تو انہیں پیٹ بھر کر روٹی میسر آتی ہے اور ان کی عزتِ نفس بحال کرنے کے بعد ان کے ہاتھوں میں کلاشنکوف دے کر طاقت کے نشے سے روشناس کرایا جاتا ہے۔ طاقت کا نشہ بھی عجب ہوتا ہے، ان کی تحقیر کرنے والا چوہدری جب ان کے سامنے دست بدستہ کھڑا ہوتا ہے تو یہ نشہ دو آتشہ ہو جاتا ہے۔

ضیاء دور میں جہادی بیانے کو عام کیا گیا، جہادی کیمپوں میں افرادی قوت جمع کرنے کے لیے مدارس کے علاوہ مسجد اور سکولوں کالجوں میں جہاد کی ترغیب دی جاتی تھی۔ چندے جمع کیے جاتے تھے۔ جمعہ کے بعد مسجد میں ایک افغانی مُلّا کی تقریر نے اسے خاصا متاثر کیا۔ جہادی تصور اللہ بخش کے لاشعور میں راسخ ہو کے رہ جاتا ہے۔ گائوں

ISSN (**Print**): 2709-9636 | ISSN (**Online**): 2709-9644
Volume 2, Issue IV, (October to Decmber 2021)

میں کنویں کھدائی کے دوران خیالی اساطیری بونے مسجد میں تقریر کرنے والی افغانی کی مانند سامنے آکر جہاد کے لیے اکساتا اور اکوڑا خٹک جا کر عملی جہاد میں حصہ لینے کا کہتا ہے۔ تبھی مغز اللہ بخش نے حکم نامہ پر عین الیقین عمل کیا۔

> ''میں کسی کو بتائے بغیر گھر سے نکلا اور کسی نہ کسی طرح اکوڑہ خٹک پہنچ گیا۔ اور وہاں کے مدرسے میں بھرتی ہو گیا۔ بڑی موج تھی، حیاتی میں پہلی بار تین وقت کی روٹی ملی۔ تین کپڑے اور چپل ملی اور سونے کی چارپائی ملی اور ساتھ دینی تعلیم تھی۔''(۱۶)

اس ناول کا کردار گُل شیر بھی ہمارے سماج کی ورکنگ کلاس سے تعلق رکھتا ہے جنہیں ہمارے سماج میں عزت کی نگاہ کی بجائے حقارت سے دیکھا جاتا ہے۔ انہیں کام کرنے کے سبب حقارت سے کمی کہا جاتا ہے۔ گل شیر کا تعلق دیر سے ہے، جہاں اس کا باپ نواب کے اصطبل میں ملازم ہے۔ دونوں باپ بیٹا کی زندگی لید صاف کرتے گزرتی ہے۔ ان کے پائوں میں کبھی جوتا نہیں دیکھا گیا۔ اس تنگی و عسرت میں گھر کا گذارہ گھوڑوں کی اس خوراک پر ہوتا ہے جو اس کا باپ اصطبل سے چوری کر کے لے آتا ہے۔ ایک دن اس کے باپ سے ایک غلطی سرزد ہوتی ہے۔ وہ نواب کے گھوڑے پر سوار ہو جاتا ہے، جسے نواب کا ملازم دیکھ لیتا ہے۔ نواب سزا کے طور پر گل شیر کے بوڑھے والد کو گھوڑا بنا کر اس پر سواری کرتا ہے اور چابک برساتا ہے۔ اس کے بعد اسے ملازمت سے نکال دیتا ہے۔ ناول نگار نے اس کردار کی وساطت سے ہمارے سماج میں راسخ طبقاتی اونچ نیچ اور وڈیرہ و سرداری نظام کی قلعی کھولی ہے جس میں جانوروں کی تو کچھ نہ کچھ توقیر ہو سکتی ہے مگر انسان جانوروں سے بھی بدتر ہوتا ہے۔ جہاں صابن کتوں اور گھوڑوں کو نہلانے کے لیے ہے، مگر انسانوں کے ہاں س کا کوئی مصرف بھی نہیں۔ ایسے سماج میں نواب خدا ہے، بلکہ خدا سے بھی اوپر ہے، کیونکہ خدا ہر خطا معاف کر دیتا ہے مگر نواب ایسا نہیں کرتا۔(۱۷) گل شیر کو مولوی کی تقریر جہاد پر لے آئی تھی۔ وہ اپنی مسلمانیت ضائع نہیں کرنا چاہتا تھا کیونکہ مولوی نے واضح کہہ دیا تھا کہ وہ مسلمان ہی نہیں جو طالبان کی مدد نہ کرے۔ لے دے کر اس کے پاس مسلمانیت ہی تو تھی۔ ساتھ مولوی نے ان بھوک کے مارے لوگوں کو یہ خبر بھی دی تھی کہ ادھر پیٹ بھر کر کھانا اور کپڑا بھی ملے گا۔(۱۸) اس بے یار مددگار لشکر کو بغیر کسی ہتھیار، ایک ماسوائے تلوار کے میدانِ جنگ میں دھکیل کر پیچھے ہٹ جاتا ہے جن کے ہاتھوں میں تلوار تھی وہ سب سے پہلے اس جہنم کا ایندھن بنتے ہیں۔ زنگ آلود تلواروں اور جدید زہریلے کیمیکل زدہ ہتھیاروں کا کیا مقابلہ تھا بھلا؟ اس سب کے باوجود وہ اس مولوی کو ایسا ولی سمجھتا ہے جو سب کچھ جان گیا تھا کہ آگے کیا ہونے والا ہے۔ اس لیے وہ بارڈر سے پیچھے ہٹ گیا تھا۔ اتنا بڑا چرکہ کھانے کے باوجود گل شیر کی اندھی عقیدت اس امر کی واضح مثال ہے۔

عقیدت اور جہالت کا علاج علم کے ماسوائے کیا ہو سکتا ہے، جس سے گل شیر بے بہرہ ہے۔ اس حالت میں کہ وہ موت کے قریب ہے اور دیگر لوگوں کے ساتھ مردہ گھوڑے کا گوشت کھا کر ایڑھیاں رگڑ رہا ہے مگر آج بھی اس مولوی کو ولی اللہ یا اللہ کا برگزیدہ بندہ گردان رہا ہے۔

"اسے اللہ کی جانب سے حکم ہو گا کہ تو اپنی اور قریبی ساتھیوں کی جان بچا کر ادھر سے نکل جا۔۔۔ تیری قسمت میں ابھی شہادت نہیں ہے۔ تو وہ نکل گیا۔۔۔ اللہ نے حکم دیا ہو گا ورنہ وہ اتنا بزدل اور کمینہ تو نہیں ہو سکتا تھا کہ ہمیں بے آسرا چھوڑ کر چلائے جائے۔۔۔۔ اسے اللہ نے کسی اور جہاد کے لیے سنبھال لیا ہو گا۔"(۱۹)

اس طبقے سے تعلق رکھنے والا ایک الگ سر زمین اور نوعیت کا کردار ابو طالب چی چی کا کردار ہے۔ اس کا تعلق چیچینا سے ہے۔ اس کے والدین تو ایک سیلاب کی زد میں آکر جاں بحق ہوئے، اس کے بعد اس کی تربیت دادی نفیسہ خاتون نے کی، جو مویشی، بھیڑ بکریاں چراتی تھی۔ ابو طالب بھی مویشیوں اور کھیتی باڑی میں اپنی دادی کا ہاتھ بٹاتے تھے۔ ایک رات دادی نے اسے جھنجھوڑ کر جگایا کہ امام شامل اس کے خواب میں آئے ہیں اور اسے پہاڑوں کی حرمت کے لیے گروزنی (چیچینا کا دار الحکومت) بھیجنے کا کہا ہے۔ ابو طالب اپنی دادی کے اس خواب کی تعبیر کے پیچھے سب کچھ چھوڑ کر نکل کھڑا ہوا اور گروزنی پہنچا۔ ابو طالب کی آنکھوں کے سامنے آباد گروزنی ملبے کا ڈھیر بنا۔ اس ملبے کے ڈھیر میں مقامی بچوں، بوڑھوں، عورتوں کے علاوہ پردیس سے جہاد کرنے کے لیے آئے ہوئے عربی، پاکستانی، سوڈانی اور افغانی بھی تھے۔ گروزنی کی تباہی کا ذمہ دار روس تھا۔ اب افغانستان کی تباہی بھی روس کے ہاتھوں سے ہو رہی تھی۔ افغانستان میں ابو طالب بدلہ چکانے اور بدلہ لینے آیا ہوا تھا۔ بدلہ اس نے روسیوں سے لینا تھا اور بدلہ چکانا افغان بھائیوں کا تھا، چونکہ وہ بھی تو ان کے لیے گروزنی میں لڑے اور جانیں دی تھیں۔ ابو طالب کسی ذاتی سوچ فکر اور نظریے کی بجائے اپنی دادی کے کہنے پر یہاں تک پہنچا تھا۔

نو تاریخیت ایک وسیع اور جامع فکر ہے جو اپنے مطالعے کی شروعات نچلی سطح سے کرتی ہے، نو تاریخیت دانوں کے لیے ایسے طبقات زیادہ اہمیت کے حامل ہوتے جنہیں تاریخ نے نظر انداز کر دیا ہے۔ نو تاریخیتی مفکرین تاریخ کو ایک بار پھر دیکھنے کی ضرورت پیش آئی۔ نئی تاریخیت کا ایک مقصد ادب اور تاریخ کے رشتے کی پیچیدگی پر از سر نو غور کرنا ہے۔ تاریخ نے نئی تاریخ کی شکل میں دوبارہ جنم لیا ہے۔ ماضی کی تاریخ کے مقابلے میں نو تاریخیت کی اصطلاح مرتب ہوئی، جو دراصل ماضی کی تاریخ میں پائی جانے والی آفاقی تاریخیت کے جوہر کی نفی ہر گز نہیں

ISSN (**Print**): 2709-9636 | ISSN (**Online**): 2709-9644
Volume 2, Issue IV, (October to Decmber 2021)

کرتی۔[۲۰] تاریخیت تاریخی مہابیانیوں اور نو تاریخیت چھوٹے بیانیوں کے گرد گھومتی ہے اور تاریخیت کے معادیاتی (Eschatological) یا کونیاتی (Ideological) مفاہیم کو ترک کرتی ہے۔ ڈان ای وین نو تاریخیت کو مابعد جدید ڈسکورس کی کئی دیگر صورتوں کی مانند منتشر داخلیت کے اثرات کے اطراف میں پھیلا زبان کا ایک کھیل قرار دیتا ہے جس میں سے کسی مربوط نظری بنیادیوں یا اس کے عاملین میں نظری یا منہاجیاتی (Methodological) قرینے کی تلاش عبث ہے۔ یہ نئی تنقید کی ماند کوئی ایک مکتب ہر گز قائم نہیں کرتی بلکہ یہ ادبی اور ثقافتی مطالعات کے شعبے میں ایک عمومی رجحان کے طور پر سامنے آتی ہے۔[۲۱] نو تاریخیت کسی ادیب کو متاثر کرنے والے تصورات، نقطہ ہائے نظریات تک محدود نہیں، اس کے ساتھ نو تاریخیت کسی ادب یا فن پارے کو کسی عہد یا علاقہ کی ثقافتی اور علمی تاریخ سے بھی جوڑتی ہے۔ نو تاریخیت کو کسی طے شدہ فکری رویے کا نام ہر گز قرار نہیں دیا جاسکتا کیونکہ نو تاریخیت ثقافت، تاریخ اور ادب کے بیچ کار فرما رشتوں کو سمجھنے کا دوسرا نام ہے۔[۲۲] تارڑ نے اپنے اس ناول میں مذکور سات کرداروں کو مختلف طبقات، تہذیب، افکار و نظریات اور معاشرت سے لے کر ان کے طبقاتی، تہذیبی اور معاشرتی تضادات اور مماثلتوں کی بنا پر جہادِ اسلام اور جہادِ افغانستان کے نام پر برپا جنگ کی بنیاد آغاز اور تاریخ سے پردہ چاک کیا ہے۔ اس جنگ کے ظاہری اور زیرِ زمین حلیفوں اور حریفوں کو بھی سامنے لاتے ہیں۔ تارڑ نے قلعہ جنگی میں جہاد اسلام اور جہادِ افغان کے فکری و نظری اور عملی عوامل اور اس کے عام و خاص پر اثرات کو پیش کرتے ہیں۔ تارڑ نے اس ناول میں ان سات مرکزی کرداروں کے علاوہ چند ایسے کردار سامنے لاتے ہیں جو ایک جھلک میں ناول میں جان ڈال دیتے ہیں۔ ان کرداروں میں مرتضیٰ بیگ کا والد ارتضیٰ جو افغان روس جنگ کا اہم پاکستان کردار ہے۔ جانی واکر کا یہودی والد جو اسے جہادِ افغان سے باز رکھنے لیے حتی المقدور کوشش کرتا ہے۔ ہاشم میر کا والد جو پاکستانی برطانوی نژاد ہے۔ یہ کردار اس طبقے کی نمائندگی کرتا ہے جن کے ہاں دوغلہ پن ہے۔ ہر جائز و ناجائز طریقوں سے دولت اکٹھی کرنا اپنا فرض سمجھتے ہیں اور مذہبی رسوم اور مذہبی کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینا ان کے شعار میں سے ہوتا ہے۔ ابو طالب چی چی کی دادی نفیسہ خاتون اور مرتضیٰ بیگ کے شہر کا نامور ہیئر ڈریسر وہ کردار ہیں جو جہاد کے فریضے کی ادائی کے لیے محرک ثابت ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ دوستم اور اس کے چند ساتھی، قندور کی گلیوں میں طالبان جو ایک لاش کے رگ و پے میں ایندھن بھر کر دیا سلائی دکھانے کے بعد محورِ قص لاش کا تماشہ دیکھنے میں مگن ہیں اور زندہ آبادی سے چل کر قلعہ جنگی کی مردہ لاشوں کے جنگل میں جھانکنے والا فرمان اللہ ناول کے منظر نامہ میں آکر ارتعاش پیدا کر دیتے ہیں۔ بارودی سرنگوں کے سبب ٹانگوں سے معذور بچے جو فٹ بال کے میدان میں گول کیپر بننے کے

ISSN (**Print**): 2709-9636 | ISSN (**Online**): 2709-9644
Volume 2, Issue IV, (October to Decmber 2021)

علاوہ اس دنیا میں کسی بھی طرح کے کردار کو ادا کرسکنے سے قاصر ہیں، جہاد افغان کے معصوم اور عام انسانوں، جو بے گناہ ہیں، پر اثرات کو واضح کرتے ہیں۔ یہ وہ کردار ہیں جنہیں تاریخ نے کبھی بھی قابلِ اعتبار نہیں سمجھا۔ نو تاریخیت دراصل تاریخ کی متنیت اور متون کی تاریخیت کا دوسرا نام ہے، نو تاریخیت ثقافتی مادیت سے خاص طرح کا متوازی رشتہ رکھتی ہے، جو تاریخ کو فقط تاریخی واقعات کا ملغوبہ بننے سے بچاتی ہے۔ نو تاریخیت پر علم بشریات کی گہری چھاپ اسے ماضی کے تاریخی شعور سے آگے کی فکر بنا دیتی ہے۔

حوالہ جات

۱۔ تارڑ، مستنصر حسین، ''قلعہ جنگی''، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۸ء، ص۴۵،۴۶

۲۔ ایضاً، ص ۱۳

۳۔ ایضاً، ص ۱۴۲

۴۔ ایضاً، ص ۱۴۴

۵۔ ایلن بی کروگر، ''غربت اور دہشت گردی؟''، مترجم: جنید احمد، (لاہور: مشعل بکس، ۲۰۱۰ء)، ص ۹

۶۔ ڈاکٹر عرفان شہزاد کا کالم ''مذہبی عسکریت پسندی کے جہادی بیانیے کی تشکیل میں مدارس کا کردار''۔ مزید دیکھئے:- https://www.humsub.com.pk/60595/irfan-shahzad-19/

136

۷۔ تارڑ، مستنصر حسین، ''قلعہ جنگی''، ص ۱۳۶

۸۔ ایضاً، ص ۵۴

۹۔ ایضاً، ص ۵۵

۱۰۔ اشتیاق احمد، ڈاکٹر، ''پاکستان عسکری ریاست''، مترجم: ایم وسیم، (لاہور: مشعل بکس، ۲۰۱۶ء)، ص ۳۶

۱۱۔ تارڑ، مستنصر حسین، ''قلعہ جنگی''، ص ۹۶

۱۲۔ ایلن بی کروگر، ''غربت اور دہشت گردی؟''، ص ۱۰،۱۱

۱۳۔ تارڑ، مستنصر حسین، ''قلعہ جنگی''، ص ۹۶

۱۴۔ شعیب خان، محمد، ڈاکٹر، ''مستنصر حسین تارڑ کا ناول قلعہ جنگی کا فنی و فکری مطالعہ''، ادبیات ناول نمبر، جلد دوم، شمارہ نمبر ۱۲۴،۱۲۳ (اسلام آباد: اکادمی ادبیات، جنوری تا جون ۲۰۲۰ء)، ص ۲۶۱

۱۵۔ تارڑ، مستنصر حسین، ''قلعہ جنگی''، ص۱۵۴

۱۶۔ ایضاً، ص۱۳۸

۱۷۔ ایضاً، ص۳۴، ۱۳۲

۱۸۔ ایضاً، ص۱۳۶

۱۹۔ ایضاً، ص۱۳۸

۲۰۔ ریاض صدیقی، ''نو تاریخیت''، مشمولہ: ''نو تاریخیت''، مرتب: ڈاکٹر نسیم عباس احمر (فیصل آباد: مثال پبلی کیشنز، ۲۰۱۸ء)، ص۳۴

۲۱۔ ڈان۔ ای۔ وین، ''نئی تاریخیت''، مشمولہ ''نو تاریخیت''، مترجم: فرحت احسان (فیصل آباد: مثال پبلی کیشنز، ۲۰۱۸ء)، ص۱۵۷

۲۲۔ ناہید قمر، ڈاکٹر، ''اردو ناول میں تاریخیت اور نو تاریخیت''، مشمولہ: ادبیات ناول نمبر، جلد اول، شمار نمبر ۱۲۴، ۱۲۳، (اسلام آباد: اکادمی ادبیات، جولائی تا دسمبر ۲۰۱۹ء)، ص۸۰، ۸۱